

عالمی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

(۲)

اجتہاد کی نئی تعریف اور نئے اصول

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اجتہاد کی ضرورت پر پہلے ایک لمبی بحث کی ہے۔ پھر اجتہاد کی نئی تعریف کے اپنے کچھ نئے اصول اجتہاد قائم کئے ہیں۔ اجتہاد کی اس نئی تعریف اور ان نئے اصولوں کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اپنی سفارشات میں کمیشن نے جو انقلابی قدم اٹھایا ہے اس کو اس وقت تک جائز اور معقول ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک اجتہاد کی نئی تعریف کر کے اس کی روشنی میں اجتہاد کے کچھ نئے اصول اختراع نہ کیے جاتے۔ ہمارا یہ بتانک کا جتنا بھی فقہی ذخیرہ ہے وہ تمام تہ اجتہاد کے ان پرانے اصولوں پر تیار ہوا ہے جو ہماری اصول فقہ کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی نئی فقہ بنانی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ پرانے اصول کا نہیں دے سکیں گے، اس کے لیے لازماً نئے اصول فقہ ایجاد کرنے پڑیں گے۔

یہ کمیشن کی سفارشات پر بحث کرنے سے پہلے ہی یہ اصول فقہ کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں تاکہ اس کا جائزہ یہ بغیر سفارشات کی اصلی قدر و قیمت واضح نہ ہو سکے گی۔

کمیشن نے جہاں تک اجتہاد کی ضرورت پر بحث کی ہے مجھے اس ضرورت سے انکار نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں اس پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا، اس سلسلہ میں مجھے اگر ارکان کمیشن سے شکایت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ یہ حضرات تخلیقی ذہن رکھنے کے معنی ہونے کے باوجود اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کوئی تخلیقی نوعیت کا استدلال نہ پیش کر سکے۔ ایک آیت نقل کی ہے تو وہ بالکل بے محل۔ دو حدیثیں نقل کی ہیں تو وہ ضعیف۔ ایک صحیح حدیث نقل بھی کی ہے تو وہ بالکل بے موقع معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا تواتر اعتماد صحیح محضانی کی کتاب "مفسرہ التشریع فی الاسلام" کے اردو ترجمے ہی پر رہا ہے۔ حالانکہ اس بات میں نہ آیات کی کمی تھی، نہ احادیث کی اور نہ عقلی دلائل کی۔ تاہم میں اس بحث کو زیادہ کریدنا نہیں چاہتا میں خود اپنے

دولت کی بنا پر اس بات کا قائل ہوں کہ اجتہاد کی ضرورت ہے، یہ ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور رہتی دنیا تک رہے گی۔ البتہ ان حضرات نے اجتہاد کی جوئی تعریف کی ہے اور اس کے جوئے اصول قائم کئے ہیں مجھے ان سے اختلاف ہے اس وجہ سے ان پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

اجتہاد کی تعریف اور اس کے شرائط | اجتہاد کی تعریف علامہ اقبال مرحوم کے حوالہ سے کمیشن نے یہ فرمائی ہے۔
”لفظ اجتہاد کے لغوی معنی کوشش کرنے کے ہیں۔ اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا مفہوم

کسی قانونی مسئلہ پر نادانہ رائے قائم کرنا ہے (گزنٹ آف پاکستان ص ۱۱۹۹)

اس اجتہاد کے لیے ان حضرات کے نزدیک علم دین میں کسی خاص مہارت یا عربی زبان کی کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کو جو کچھ علم رکھتا ہے حق حاصل ہے کہ وہ اجتہاد کرے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام میں پائیت نہیں ہے، اس نے پادریوں اور عوام کو الگ الگ تقسیم کر کے پادریوں کو کچھ خاص امتیازی حقوق نہیں دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

”حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک عام عورت بھی بسا اوقات خود ان سے بہتر فیصلے دیتی ہے، اگر

وہ علم کے ساتھ بات کرتی ہے تو وہ اپنا ایک ایسا حق استعمال کرتی ہے جو اسلام کی رو سے اسے

حاصل ہے“ (گزنٹ آف پاکستان ص ۱۲۰۱)

کمیشن کے نزدیک تمام آئمہ و مجتہدین کے متفق علیہ اجتہادات کے خلاف بھی اجتہاد کیا جاسکتا ہے بلکہ عملاً کمیشن نے ایسا کیا بھی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ان آئمہ میں سے کوئی صاحب بھی معصوم نہیں تھے۔ اور یہ کہ جس طرح سائنس میں کسی دور کے تمام سائنس دانوں کا کسی بات پر اتفاق بھی اس بات کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا، اسی طرح قانون کی تاریخ میں بھی کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی امر پر اجماع اس کی صحت و صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

”اور بعض معاملات میں کمیشن نے قرآن اور سنت کے اصل احکام کو بعد کے فقہاء کے اجتہادات

پر ترجیح دی ہے، قطع نظر اس سے کہ ان کے اتفاق یا اختلاف کا درجہ کیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے

کسی نے بھی اپنے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ جس طرح سائنس میں ہے اسی طرح قانون

کی تاریخ میں بھی یہ بات ہے کہ بعض اوقات کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی بات اجماع بھی اس کی صحت و صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ (ص ۱۲۳۲)

اجتہاد کی بحث میں کمیشن نے اس طرح کے جواہر زینے بکھیرے تو بہت ہیں لیکن میں طوالت سے بچنے کے لئے صرف مذکورہ بالا چند نکات ہی پر اپنی بحث کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔

اسلامی اصطلاح میں اگر اجتہاد کے معنی کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ اظہار خیال یا آزادانہ رائے قائم کرنے ہی کے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عام قانون سازی اور اسلامی اصول فقہ کے اجتہاد میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بس الفاظ کا فرق ہے مسلمانوں نے اپنی قانون سازی کا نام اجتہاد رکھ چھوڑا ہے۔ دوسرا اسی مفہوم کو اپنی اپنی زبانوں اور اپنی بولیوں میں کسی اور طرح تعبیر کرتے ہیں حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو امریکہ کی پارلیمنٹ جب قانون سازی کرتی ہے تو وہ بھی حقیقت اجتہاد ہی کرتی ہے بڑا ہی پارلیمنٹ کے ارکان جب کسی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں تو وہ بھی اجتہاد ہی فرماتے ہیں اور بھارت کی پارلیمنٹ کے ارکان جب کسی قانونی مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو وہ بھی اجتہاد ہی ہوتا ہے۔ اور یہ سارے ہی اجتہاد گویا اسلامی اجتہاد ہیں کیونکہ سب آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں۔

اگر یہ حضرات یہ فرماتے کہ ان کے نزدیک اجتہاد کی تعریف یہ ہے تو ہم کو اس پر زیادہ اعتراض نہ ہوتا لیکن جب ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اسلامی قانون کی ایک اصطلاح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجتہاد کا یہ مطلب کسی آیت یا کسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے یا کسی اجتہاد اور کسی فقیہ نے یہ بیان کیا ہے علامہ اقبال نے اگر کہیں یہ بات لکھی ہے تو یہ کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ یہ اصطلاح علامہ اقبال کی نہیں ہے بلکہ فقہاء اور اصولیوں کی ہے، انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس اصطلاح کا مطلب بیان کریں اور جو مطلب وہ بیان کریں گے وہی مطلب اس کا ہر ایک کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر کسی کو اجتہاد کی اس تعریف سے اختلاف ہو جو فقہاء اس کی کرتے ہیں تو اس کو چاہئے کہ دلائل کے ساتھ پہلے اس کی تردید کرے اور پھر کتاب و سنت کی روشنی میں خود اپنی تعریف پیش کرے۔ لیکن جو اصطلاح ان کی ہے اس کا مطلب خود وضع کرنا اور اس کو ان کے سر چپک دینا، کوئی انصاف نہیں ہے۔

میں ہر دور کے ماہرین فقہ و اصول فقہ کی کتابوں کی مراجعت کے بعد یہ عرض کرتا ہوں کہ اجتہاد کے یہ

معنی کسی نے بھی نہیں ایسے ہیں۔ افسوس ہے کہ تمام مستند کتابوں کے حوالے نقل کرنے میں خواہ مخواہ کی طوالت ہوگی ورنہ میں ہر موعود کی کتابوں کے حوالے یہاں پیش کر دیتا۔ تاہم عام ناظرین کے اطمینان کے لیے چند حوالے پیش کرتا ہوں۔

علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی لغوی تعریف کرنے کے بعد اس کی فنی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

"اصوبوں کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے۔ اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شرع کے موافق ہے"

(ص ۲۱۸ ج ۲)

امام شافعی کی الموفقات میں اجتہاد کی یہ تعریف ہے:-

"اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔ (ص ۸۹ ج ۲)

صحیح مصنفی کی کتاب "فلسفہ التشیع فی الاسلام" کمیشن کے نزدیک غالباً مستند ترین ماخذوں میں سے ہے اس وجہ سے اجتہاد کی جو تعریف اس نے کی ہے وہ یقیناً سن لیجئے:-

"نفت میں اجتہاد کے معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس

سے مراد وہ کوشش صرف کرنا ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے

یعنی دین کے ان سرچشموں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے احکام استنباط کرنے کی سعی کرنا۔ (ص ۱۵۳)

دیکھئے بات کیا تھی، اور ان حضرات نے کیا بنیادی کجادیں کے اصلی سرچشموں سے انکسار مستنبط کرنا

اور کج کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا؟ کیا ان دونوں میں آسمان و زمین کا فرق نہیں ہے؟ لیکن

ارکان کمیشن اگر اجتہاد کی یہ تعریف نہ کریں تو اپنی ان سفارشات کو دین کے اندر کس طرح شامل کر سکتے

ہیں جو دین کے ماخذ سے اسی قدر بے نیاز ہیں جس قدر امریکی یا بھارتی مجلس قانون ساز کا آزادانہ اجتہاد۔

ارکان کمیشن نے امام مالک کا ایک قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں کبھی

صحیح بات کہتا ہوں اور کبھی غلطی کر جاتا ہوں، میری راپوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول پر جانچ لیا کرو۔ اگر ان کے موافق نہ پاؤ تو ان کو پھینک دو۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ نہ میری پیروی کرو نہ مالک کی، نہ شافعی کی اور نہ ثوری کی بلکہ انہی سترہوں سے احکام مستنبط کرنے کی کوشش کرو جن سے انہوں نے مستنبط کیے کمیشن نے یہ اقوال یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیے ہیں کہ یہ آئمہ اپنے آپ کو معصوم نہیں سمجھتے تھے۔ بلاشبہ ان اقوال سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ لیکن کیا انہی اقوال سے حقیقت بھی واضح نہیں ہوتی کہ اجتہاد آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دین کے اصلی سترہوں سے احکام مستنبط کرنے کا نام ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو امام مالک اپنے اجتہادات کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھنے کا کیوں مشورہ دیتے اور امام احمد بن حنبل کیوں فرماتے کہ براہ راست دین کے سترہوں کی طرف توجہ کرو۔ جو رائے آزادانہ قائم کی گئی ہو اس کو کتاب و سنت پر پرکھنے سے کیا حاصل؟

اب اس سلسلہ کی دوسری بات یہ ہے۔ اس اجتہاد کے لیے ان حضرات کے نزدیک کسی خاص علم و قابلیت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ڈیڑھ کر لیس کی صحیح روح کو بردے کا رولانے کے لیے یہ حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اجتہاد کرے۔ اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں یہ حضرت عمرؓ کے زمانہ کی ایک خاتون کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک معاملہ میں عین منبر پر حضرت عمرؓ کو ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ نے ان کے اجتہاد کی تعریف فرمائی۔

اور اگر بدرجہ ادنیٰ اس کے لیے یہ کسی علم کی ضرورت سمجھتے بھی ہیں تو وہ علم بہر حال قرآن، حدیث، یا عربی زبان کا علم نہیں ہے بلکہ اس کے لیے یہ اس علم کو بالکل کافی سمجھتے ہیں جس کے یہ خود حامل ہیں۔ اپنے اس استحقاق کو ثابت کرنے کے لیے ایک بات تو انہوں نے یہ پیش کی ہے کہ اسلام میں یہ پائیت نہیں ہے بلکہ یہاں علماء اور عوام ایک ہی سطح پر ہیں۔ اور دوسرا کارنامہ یہ انجام دیا ہے کہ جہاں جہاں کوئی ایسی حدیث نقل کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے جس میں عالم یا علماء کا لفظ آیا ہے تو اس کا ترجمہ مسلم سکالر (MUSLIM SCHOLAR) اور تعلیم یافتہ لوگ (PEOPLE WITH KNOWLEDGE) سے کیا گیا ہے تاکہ حدیث سے یہ بات جو واضح ہوتی ہے کہ اجتہاد علماء ہی کا منصب ہے، ترجمہ کے تصرف سے اس پر پردہ ڈالا

ہائیکے اور عربی سے بے خبر لوگوں پر یہ دھونس جم سکے کہ خود حدیث میں بھی اجتہاد کا منصب عام تعلیم یافتہ لوگوں ہی کا بتایا گیا ہے، نہ کہ کتاب و سنت کے عاملوں کا۔

اگر اجتہاد کی یہ تعریف مدح ہے جو ان حضرات نے پیش کی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ اس کے لیے نہ کسی خاص علم کی ضرورت ہے نہ کسی خاص طرح کے سیرت و کردار کی، جو شخص جی کچھ عقلی گدے لگا سکتا ہے اس کا یہ جمہوری حق ہے کہ وہ بے لکھن اجتہاد کرے۔ لیکن اگر اجتہاد کی تعریف وہ ہے جو اس اصطلاح کے وضع کرنے والوں نے کی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کرنے والا دین میں گہری بصیرت رکھتا ہو۔ دین کی بنیادی چیزیں جس زبان میں ہیں اس زبان سے اس کو عالمانہ واقفیت ہو، نیز سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ اس لائق ہو کہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں اس پر اعتماد کر سکیں۔ انہی صفات کے اشخاص کے لیے قرآن اور حدیث میں علما کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ درحقیقت ایک صفاتی لقب ہے، کوئی خاندانی یا طبقاتی لقب نہیں ہے۔ بد قسمتی سے آج اس لقب سے ایسے بہت سارے لوگ بھی مقرب ہو گئے ہیں جو فی الحقیقت اس لقب کے اہل نہیں ہیں لیکن اس اقتباس کے باوجود حقیقت اپنی جگہ پر ہے۔ علم و فضل اور سیرت و کردار ایسی چیزیں نہیں ہیں جو چھپی رہیں۔ ایک صفاتی گروہ کو ایک مستقل طبقہ کی حیثیت میں رکھ کر اس کے خلاف تعصب میں مبتلا ہو جانا اور دوسروں کو بھی اس کے خلاف تعصب کے لیے اکسانا ایک سخت قسم کی تنگ نظری اور تنگ دلی ہے بلکہ اس سے ایک گہرے قسم کا احساس کہتری بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایک منصب جو صفات کی بنا پر حاصل ہوتا ہے اور اکتساب سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آپ اسے خود حاصل کر لیجیے، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ آپ کو اس منصب تک پہنچنے سے روک سکے۔ لیکن یہ عجیب و دردناک صورت حال ہے کہ آپ کو اتنا تو دین اور شریعت کا ایک حرف نہیں لیکن اس میں اجتہاد ضرور فرمائیں گے کیونکہ دین کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اگر یہ منطق صحیح مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہونے کہ ہائی کورٹوں میں بیٹھ کر مقدمات کے فیصلے کرنا بھی صرف ماہرین قانون ہی کا حق نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر شخص کو حق ہونا چاہیے کہ وہ مقدمات کے فیصلے لکھے اور قانونی معاملات میں اپنی رائیں منوائے، علاج کرنے کا حق بھی صرف طبیوں اور ڈاکٹروں ہی کو نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر شخص کو اجازت دے

دینی چاہیے کہ وہ لوگوں کی جانوں کے ساتھ بازی کھیل سکے۔ نہروں اور پلوں کی تعمیر بھی صرف انجنیئروں ہی کا اجارہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ جو شخص صحیح طور پر دوائینٹیس علی جوڑ نہ سکتا ہو اسے بھی حق ہونا چاہیے کہ وہ نہروں اور پلوں کی تعمیر میں اپنی رائے دے سکے۔ اگر یہ ڈیموکریسی ہے تو یہ ڈیموکریسی دنیا کے لیے نعمت ہے اور اسلام اس ڈیموکریسی کا وادار نہیں ہے۔ اگر ایک چیز میں دخل دینے کے لیے کسی علمی و فنی قابلیت کی ضرورت ہے تو اس میں شخص ملے دینے کا اہل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بات صحیح ہے کہ اجتہاد کے لیے دین میں بصیرت ضروری چیز ہے تو اس شخص کے مجتہد بن کر بیٹھ جانے کے کیا معنی جسے دین سے سرے سے کوئی مس ہی نہیں؟ اسلام میں پاپائیت تو بے شک نہیں ہے لیکن آخر اسلام خدا کا دین ہے۔ کوئی باز بچہ اطفال تو نہیں ہے؟

ارکان کمیشن نے عہد فاروقی کی جن خاتون کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے خود حضرت عمرؓ کو ان کے ایک اجتہاد پر ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ نے نہ صرف ان کی رائے قبول فرمائی بلکہ اس کی تحقیر بھی کی، انہوں نے اس نظریہ کے تحت اپنی رائے نہیں پیش کی تھی کہ دین میں جمہوریت ہے اور یہاں علماء اور عوام میں اجتہاد کے معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے جو رائے مہر کم باندھنے کے بارے میں ظاہر کی تھی وہ ان خاتون کو قرآن کے لفظ قطار کے واضح مفہوم کے خلاف نظر آئی۔ اس کو انہوں نے ظاہر کیا اور حضرت عمرؓ نے ان کی رائے معقول اور مبنی بر قرآن ہونے کی وجہ سے فوراً قبول کر لی۔

انہی خاتون کی طرح اسلام میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی کسی رائے پر قرآن و حدیث سے استدلال کرے اور اس کی معقولیت کی بناء پر اس رائے کو تسلیم کر لے۔ ضرورت جس چیز کی ہے وہ قرآن و حدیث کا علم اور دین کا فہم و شعور ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ دین کے معاملات میں کلام کرنے کے لیے کسی خاص درجہ کا فاضل ہونا یا کسی مخصوص گروہ سے متعلق ہونا شرط ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی شرط نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا اتنا علم تو ہونا چاہیے جتنا ان خاتون کو تھا۔ میں نے اس رپورٹ میں ارکان کمیشن کے اجتہادات دیکھے ہیں اور جن کو آگے چل کر میں ناظرین کو بھی دکھائوں گا ان کا موازنہ جب میں ان خاتون کے اجتہادات کرتا ہوں تو میں واضح طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ان خاتون کا تنہا علم قرآن اس پورے کمیشن کے مجموعی علم دین سے بھی بدرجہا زیادہ تھا۔

اگرچہ اجتہاد کی صحیح تعریف سامنے آجائے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ ایک مجتہد میں کیا صفات ہونی ضروری ہیں لیکن مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں اسلامی اصول قانون کے چند مستند ماخذوں کے حوالے بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

علامہ آمدی اپنی کتاب میں مجتہد کے لیے دو شرطیں ضروری قرار دیتے ہیں:-

”ایک یہ کہ وہ خدا کے وجود، اس کی صفات، اس کے کمالات کو جاننا اور ماننا ہو۔
اور رسول اور اس کی لائی ہوئی شریعت اور اس کے معجزات کو تسلیم کرتا ہو۔“

دوسری یہ کہ اسلامی شریعت کے احکام اور ان کے سرچشموں اور ان کے اقسام کا عالم ہو۔ جتنا ہو کہ ان کے اثبات کے کیا طریقے ہیں، یہ اپنے مددلات پر کن کن طریقوں سے دلالت کرتے ہیں۔ ان کے درجات میں کیا اختلاف ہیں، ان میں کن شرائط کا لحاظ ضروری ہے، اگر ان میں اختلاف ہو تو ترجیح کے کیا کیا طریقے ہیں، ان سے احکام کس طرح مستنبذ کیے جاتے ہیں، نیز ان کو مکمل اور بیان کرنے پر قادر ہو، ان پر جو اعتراضات وارد ہوں ان سے بچ سکتا ہو۔ اس کی مزید تکمیل اس بات سے ہوئی کہ راویوں اور جرح و تعدیل کے طریقوں سے باخبر ہو..... اسباب نزول اور نسخ و منسوخ سے واقف ہو..... اور عربی زبان اور نحو کا عالم ہو۔

دالاحکام فی اصول الاحکام ج ۴ ص ۲۱۹،

امام شاطبی فرماتے ہیں:-

”دیجہ اجتہاد: اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں دو صفتیں موجود ہوں۔“

ایک یہ کہ وہ شریعت کے مقاصد کا پوری طرح فہم رکھتا ہو، دوسری یہ کہ وہ اس فہم کی

رہنمائی میں شریعت سے مسائل استنباط کرنے پر قادر ہونے (الموافقات ج ۴-۱۰۶)

کیشن کا سب سے زیادہ مستند ماخذ صبحی محمد صافی اپنی کتاب فلسفہ التشریع میں اجتہاد کے لیے حسب ذیل صفات ضروری سمجھتا ہے۔

اجتہاد کرنا ہر شخص کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک خاص قابلیت کی

ضرورت ہے جس سے مجہد استدلال و استنباط کے پیش نظر مقصد کا اہل ہو سکے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ پختہ فکر اور دانشمند ہو۔ اخلاق حسنہ سے متصف اور دین کے سرچشموں کا عالم ہو یعنی شرعی دلیل اور ان کے تلاش کے طریقوں اور ان کے متعلقات۔ عربی زبان، تفسیر، اسباب، نزول احوال، اُتوات جرح و تعدیل اور نسخ منسوخ سے پوری طرح باخبر ہو۔ (فلسفہ التشریح ص ۱۵۵)

کیا کیشن کے ارکان یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اجتہاد کے ان ٹرنلٹ پر پورے اترتے ہیں؟

اب اس سوال کو لیجئے کہ تمام آئمہ نے متفق علیہ مسلک کے خلاف بھی اجتہاد کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا ایک پہلو تو عقلی ہے اور دوسرا واقعاتی۔ جہاں تک اس کے محض عقلی پہلو کا تعلق ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس پہلو سے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، یہ آئمہ غلطی سے مبرا نہیں تھے اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ کسی امر اجتہادی پر سب متفق ہوں اور وہ بات صحیح نہ ہو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو بات عقلاً محال نہ ہو وہ واقعہ کی حیثیت سے موجود بھی ہو۔ علامہ اقبال سے بڑا شاعر ہونا محال نہیں ہے لیکن اگر محض اس دلیل کی بنا پر کہ ان سے بڑا شاعر ہونا محال نہیں ہے، میاں عبدالرشید صاحب یا خلیفہ صاحب یا ان کی شریک کار سیمات میں سے کوئی صاحب یہ دعویٰ کر بیٹھیں کہ ہم ان سے بڑے شاعر ہیں تو یہ سب حضرات مجھے معاف کریں کہ میں ان کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کروں گا کیونکہ ہمارے سامنے ان کا کوئی بھی ایسا شعری یا ادبی کارنامہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم ان کو شعراء دہ پر گفتگو کر لے کا بھی اہل سمجھیں چہ جائیکہ ان کو آئمہ شعر و سخن کا ہمہ مان لیں یا کچھ ان سے بھی ادنیٰ درجہ ان کا تسلیم کریں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ بیک مسئلہ جس پر امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے عالی مقام لوگ متفق ہیں اس کے خلاف دین کے معاملہ میں کوئی شخص خلیفہ عبدالحمید، میاں عبدالرشید بیگم شاہنواز اور بیگم شمس النہار کے فتوے پر کوئی مسلمان کس طرح اعتماد کر سکتا ہے؟ ایک محتاط مسلمان کے لیے تو ان حضرات پر یہ اعتماد کرنا بھی مشکل ہے کہ ان میں سے کسی صاحب کو صحیح طور پر طہارت کے اسلامی آداب بھی معلوم ہیں یا نہیں کچھ کہ وہ ان کی فقاہت اور ان کے اجتہاد کے پیچھے دین کے مسلمہ آئمہ کے متفقہ اجتہاد یا ان کے اجماع کو نظر انداز کر دے!

یہ نہ خیال کیجئے کہ ان آئمہ پر مسلمانوں کا یہ غیر معمولی اعتماد محض کسی اتفاق کا نتیجہ ہے، یا محض تقلید اور قدامت پرستی کا ایک مظہر ہے۔ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے تو یہ محض ایک داہمہ ہے۔ تقلید اور

امت پرستی سے عوام کے ایک طبقہ کے اندر تو ان احساس یا نظریات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ساری دنیا اندھی نہیں ہو جاتی۔ اور اگر بالفرض ساری دنیا اندھی ہو جاتی ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ اس طرح کے عالم گیر اندھے پن کو دور کرنے کے لیے وہ روشنی بالکل ناکافی ہے جو اس کمیشن نے دکھائی ہے اس سے بجائے اس کے کہ تاریکی دور ہو اندھیرے میں اور اضافہ ہو گا۔ جو لوگ اس اعتماد کو مسلمانوں کا جمود سمجھتے ہیں ان کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اس جمود کو امام ابن تیمیہؒ جیسا زلزلہ ڈال دینے والا انسان بھی ہلا نہ سکا اور شاہ ولی اللہؒ جیسے صاحب فکر اور نقاد کو بھی اس کے ساتھ سازگاری کرنی پڑی، حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بتے تکلف اور بالکل بجا طور پر علم اولین کا حامل اور وارث قرار دیا جاسکتا ہے۔ بھرتباہیئے کہ اس کو چہ میں میاں عبدالرشید اور خلیفہ صاحب کو کون پوچھتا ہے کہ آپ کس حکیت کی مولیٰ ہیں۔ درحقیقت ان آئمہ نے اپنے علم، اجتہاد، بیعت اپنے تقویٰ، اپنی نکتہ رسی، اپنے تبحر اور دین کے لیے اپنی جانبازیوں اور قربانیوں سے اس امت پر ایک ایسی محبت قائم کر دی ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کبھی یہ دوسرے بھی نہیں گزرتا کہ ان میں سے کسی نے کبھی ان کے دین کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی ملامت یا کسی کمزوری یا دین بازی کا ارتکاب کیا ہو گا آخر ان آئمہ ہدایت کے مقابل میں مسلمان ان لوگوں پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں جن کی زندگیوں یا دین کے ساتھ اشتہار اور تلعب میں گزری ہیں یا حکم کھلا دین بازی اور فتویٰ فروشی میں۔

ارکان کمیشن کا یہ نظریہ بھی نہایت عجیب ہے کہ جس طرح سائنس میں کسی ایک دور کے تمام سائنس دانوں کا کسی ایک نظریہ پر اتفاق اس کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا اسی طرح مذہب میں بھی کسی ایک بات پر سارے آئمہ کا اتفاق اس کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ اول تو مذہب کا سائنس پر قیاس ایک قیاس مع الفارق ہے۔ سائنس کی بنیاد قیاسات و تجربات پر ہے اور مذہب کی اساس وحی کی یقینیات پر۔ اس وجہ سے سائنس میں تو ہر وقت اس بات کا امکان ہے کہ آج آپ ایک چیز کو ثابت مانیں اور کل وہ سیارہ نکلے اور کل جس چیز کو آپ مرکز مانتے رہے ہیں آج وہ کسی دوسرے مرکز کے تابع ہو جائے۔ لیکن مذہب میں یہ غلطی اگر ہو سکتی ہے تو وحی کی یقینیات میں نہیں بلکہ حالات پر اس کے انطباق میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی اس دائرہ میں نہیں جس دائرہ

میں انطباق کا یہ کام خود صاحب وحی یعنی پیغمبر نے انجام دے دیا ہے بلکہ صرف اس دائرہ میں ہو سکتی ہے جہاں یہ کام غیر معصوم انسانوں نے انجام دیا ہے۔ پھر ان غیر معصوم انسانوں کے بھی مختلف درجات ہیں اور انہوں نے دین کو زندگی کے حالات پر منطبق کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کے بھی مختلف درجے ہیں اور ان درجات کے اختلاف کے لحاظ سے مسلمانوں کا اعتقاد بھی ان پر مختلف درجے کا ہے مثلاً ایک انطباق تو وہ ہے جس پر خلفائے راشدین اپنے دور کے اہل علم و تقویٰ کے مشورہ کے بعد متفق ہو گئے ہیں۔ یہ اسلام میں اجماع کی بہترین قسم ہے اور یہ بجائے خود ایک شرعی حجت ہے۔ اسی طرح ایک انطباق وہ ہے جس پر آئمہ اربعہ متفق ہو گئے ہیں، یہ اگرچہ درجہ میں پہلی قسم کے اجماع کے برابر نہیں ہے تاہم چونکہ یہ امت میں حجت الامت ان آئمہ پر متفق ہو گئی ہے اور ہر دور کے اہل علم و تقویٰ ان کی دینی بصیرت، ان کے تجربہ، ان کے مرتبہ اجتہاد اور ان کے تمسک بالکتاب و سنہ کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور ان کے دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش مثال ہی سے کسی نے کی ہے اس وجہ سے ان آئمہ کے کسی اجماع کو محض اس دلیل کی بنا پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ معصوم نہیں تھے۔ یہ معصوم تو بے شک نہیں تھے، لیکن ان کے معصوم نہ ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کسی امر پر ان کا اتفاق بھی دین میں کوئی حجت نہ بن سکے۔

میں حیران ہوں کہ میاں عبدالرشید صاحب جیسے قانون دان نے بھی سائنس اور قانون کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ سائنس میں نظائری کی کوئی بھی حیثیت نہیں ہے، لیکن قانون میں بالخصوص اس قانون میں جس کی سند میاں عبدالرشید صاحب نے حاصل کی ہے، ساری بنیاد ہی نظائری پر ہے۔ اگر اس کے اندر سے نظائری کو نکال دیجیے یا ان کو ناقابل اقامت قرار دے دیجیے تو پھر کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ کیا میاں عبدالرشید صاحب فرما سکتے ہیں کہ انگریزی قانون میں بھی اعلیٰ عدالتوں کے نظائری کی وہی حیثیت ہے جو حیثیت وہ اسلامی قانون کے نظائری کو دینا چاہتے ہیں؟

اس سلسلہ میں کمیشن نے ایک بات قابل لحاظ لکھی ہے۔ مسلمانوں کی تقلید اور جوہر پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ عباسیوں کے دور کے خاتمہ پر جب تاتاریوں نے تمام علی مراکز تباہ کر دیئے، متبغیہ جلا بیٹے اور لوگوں کے اندر آزادانہ فکرو اجتہاد کے حوصلے سرد پڑ گئے تو اسلامی قانون کو دوسرے درجے کے

محترمین (INNOVATORS) اور نااہلوں کی دستبرد سے بچنے کے لیے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ غلط اجتہاد کے بجائے پچھلے ائمہ کی تقلید کی جائے کیونکہ غلط اور ناقص اجتہاد سے وہ ذہنی انتشار جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھا اور زیادہ بڑھ جاتا۔

یہ تاریخی تجزیہ اگرچہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن اگر کمیشن کے فاضل ارکان اس تجزیہ کو اتنی تقلید کے جواز کی اس دلیل کو کچھ وزن دیتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں وہ کونسا مبارک انقلاب آگیا کہ ارکان کمیشن اجتہاد کا دروازہ چوڑا کھول دینے کے لیے بالکل بتیاب ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بیانات نے بھی باب اجتہاد پر بیجا کر دی ہے۔ عباسیوں کے دفعہ کے خاتمہ پر تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو تباہی آئی میرے نزدیک وہ تباہی اتنی وسیع الاثر نہیں تھی جتنی وہ تباہی وسیع الاثر تھی جو سلطنت مغلیہ کے خاتمہ پر انگریزوں کے ہاتھوں نازل ہوئی۔ تاتاریوں کی لائی ہوئی تباہی سے مدرسے اور کتب خانے جتنے بھی برباد ہوئے ہوں اس سے انکار نہیں لیکن اذ بان و غلوب پراہتوں نے وہ اثر نہیں ڈالا جو انگریزوں نے ڈالا۔ انگریزوں نے ہمارے کتب خانے جلائے تو نہیں لیکن اس نے ہمارے ذہنوں کو اس طرح مسموم کر دیا کہ ہم اپنے کتب خانوں کو ردی کے ڈھیر خیال کرنے لگے۔ اس نے ہمارے مدرسے ڈھائے تو نہیں لیکن دین اور دینی تعلیم سے اس نے ہمیں اس طرح متنفر اور سیرا کر دیا کہ ہم دینی مدرسوں میں داخل ہونے کو عار سمجھنے لگے۔ اس نے ہماری فکر و نظر کی آزادی کو بالکل سلب تو نہیں کیا لیکن ہمیں مرعوب اس طرح کر دیا کہ ہمارے لیے فکر و عمل کے ہر میدان میں وہی معیار حق بن گیا۔ پھر ایسے حالات میں کیا یہ مصلحت نہیں ہے کہ اسلامی قانون کو دوسرے نہیں بلکہ تیسرے درجہ کے محترمین کے اجتہادات سے محفوظ رکھا جائے اور جو انتشار ذہنوں میں پہلے سے پیدا ہو چکا ہے اس کے بڑھانے کے مزید اسباب فراہم نہ کیے جائیں؟

میں پھر ایک مرتبہ اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں تک اجتہاد کی ضرورت کا تعلق ہے میں اس بات کا اس سے زیادہ شدت سے قائل ہوں جتنی شدت سے اس کے قائل ارکان کمیشن ہیں لیکن آخر اہمیت و صلاحیت تو اس کے لیے ایک شرط ضروری ہے۔ ہر مدعی منصب اجتہاد کا حقدار تو نہیں بن سکتا۔ اجتہاد کی اس تعریف کے بعد کمیشن نے کچھ نئے اصول اجتہاد ایجاد کیے ہیں۔ اب ہم ان پر بحث کریں گے

معاشرتی انصاف اور حکومت | کمیشن نے اپنے اجتہادات کے سلسلہ میں ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ
”حکومت معاشرتی انصاف کی نگہبان (CUSTODIAN) ہے“

اس اصول کا ذکر اگر کسی فلسفہ سیاست کی کتاب یا کسی حکومت کے دستور میں ایک رہنما اصول کی حیثیت سے آتا تو ہم اس سے تعرض نہ کرتے لیکن اس رپورٹ میں اس کا حوالہ جس پہلو سے آیا ہے وہ قابل غور ہے۔ اس رپورٹ میں اس کا ذکر اس حیثیت سے آیا ہے کہ معاشرتی معاملات سے متعلق قانون سازی کرتے وقت حکومت پاکستان کو از روئے فروع کیا پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ کمیشن کا مشورہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں حکومت کو تمام قیدیوں اور پابندیوں سے آزاد ہو کر قانون سازی کے لیے اقدام کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت اس رپورٹ میں ایک سے زیادہ مقامات میں حکومت کو اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ کسی چیز کی پرمایہ بغیر کمیشن کی پیش کردہ سفارشات قبول کرے اور ان کے مطابق قانون بناوے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

”بدقسمتی سے اس وقت مسلم معاشرہ زندگی کے ایسے اہم معاملات میں اشارہ نہ ملتا ہے نکاح، طلاق،

تعدد ازواج وغیرہ کے ان معاملات کی طرف جن کے بارے میں کمیشن نے سفارشات پیش کی ہیں؛ بل

غیر مذکور ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے حکومت کے لیے عجز دی ہو گیا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کے لیے

اقدام کرے جو ان پھیلی ہوئی برائیوں کو روک سکیں“ (گڈ آف پاکستان، ص ۱۲۲۹)۔

اس اصول کو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت سوشل جسٹس کی کسٹوڈین ہوتی ہے اور ہماری حکومت

بھی سوشل جسٹس کی کسٹوڈین ہے لیکن اس کے کسٹوڈین ہونے کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس اصول کی آڑ

لے کر نئے قوانین بنانے شروع کر دے اور مذہب اور دستور کسی چیز کی بھی پروا نہ کرے۔ ہمارے ملک

کے دستور میں جمہوریت، آزادی، مساوات، برادری، اور معاشرتی انصاف کا صرف وہی تصور جائز اور

معقول تسلیم کیا گیا ہے جو اسلام نے دیا ہے چنانچہ دستور کے دیباچہ (PREAMBLE) میں یہ

الفاظ ثبت ہیں۔

”جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، برادری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو جس طرح اسلام

نے ان کی تشریح کی ہے (AS ENUNCIATED BY ISLAM) پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا:

ملاوہ ازیں سوشل جسٹس کا جس حد تک تعلق پرسنل لاسے ہے اس پر ایک مزید قید ہمارا دستور یہ بھی عائر کرتا ہے کہ کسی فرقہ کے پرسنل لا میں حکومت کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی۔ ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت کا اصلی منصب درحقیقت ہے بھی یہی کہ وہ دنیا میں خدا کے قانون کو جاری کرنے والی ہوتی ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی اپنی طرف سے کوئی نیا دین ایجاد کرنے کی جرأت نہیں کرتی۔ اس حقیقت کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہونے کے بعد اپنے پہلے ہی خطبہ میں اس طرح ظاہر فرمایا کہ ”میں خدا کی شریعت کا نافذ کرنے والا ہوں اپنی جانب سے کوئی نئی چیز ایجاد کرنے والا نہیں ہوں۔“

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ قانون سازی کا یہ فارمولا کمیشن نے کس کی خاطر ایجاد فرمایا ہے۔ جہاں تک پاکستان کی حکومت کا تعلق ہے وہ تو اس اصول سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی جو اربابن کمیشن کے پیش نظر ہے اس سے اگر فائدہ اٹھا سکتی ہے تو ایک کلیت پسند ریاست (TOTALITARIAN STATE) فائدہ اٹھا سکتی ہے لیکن پاکستان کی ریاست ایک پابند آئین ریاست ہے جس کی قانون سازی کی آزادی پر اس کے دستور نے بہت سی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور جب تک وہ ایک بالکل مطلق العنان حکومت بن جانے پر آمادہ نہ ہو جائے اس کے لیے ان پابندیوں کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔

صرف۔ پاکستان ہی کی حکومت کی کیا تخصیص ہے، اس وقت تو دنیا میں کوئی حکومت بھی ایسی نہیں ہے جو سوشل جسٹس کی نگہبانی کے یہاں معاشرتی زندگی کے لیے من مانے قوانین بنانے کی جسارت کا ارتکاب کرے۔ اس قسم کی جسارت ماضی قریب میں اگر کسی حکومت نے کی ہے تو وہ روس کی اقترار کی حکومت ہے۔ اس نے عین اسی اصول کی رہنمائی میں اپنے قوانین ازدواج ۱۹۱۸ء و ۱۹۲۶ء میں اپنے ملک کے سابق معاشرتی و ازدواجی قوانین پر یک گردش قلم تلمیٹ کر کے رکھ دیئے تھے۔ تمام بچے ریاست کی ملکیت اور مذہب کے تحت باندھے ہوئے تمام نکاح کا عدم قرار دے دیئے گئے تھے، خاندان کے نظام کو سمریہ جاری کی آخری کمین گاہ چھیرا یا گیا، طلاق دینے کے لیے میاں اور بیوی دونوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ جب چاہیں ایک کارڈ کے ذریعہ سے اپنے ارادہ طلاق سے ایک دوسرے کو مطلع کر دیں۔ حرامی اور

سبائز اولاد کے حقوق قانونائیکساں کر دیئے گئے۔ ان تمام کارناموں کے لیے دلیل یہ تھی کہ حکومت سوشل سسٹم کی کسٹوڈین ہے لیکن سبب اس کے نتائج سامنے آئے اور حرامی نیچے فوج در فوج سڑکوں پر باطلے کتوں کی طرح پھرنے لگے اور عورتوں کی عزت کیتوں کے برابر بھی باقی نہیں رہ گئی تب سوشل سسٹم کے ان نگہبانوں کو ہوش آیا اور پھر پچھلے قوانین بحال کیے گئے۔ کیا ارکان کمیشن یہ اصول قانون سازی پیش کر کے اپنی حکومت کو بھی یہی راہ دکھانے کے خواہشمند ہیں؟

الگ الگ دور الگ الگ احکام | کمیشن کا دوسرا اصول اجتہاد یہ ہے کہ ”اسلامی احکام میں اس امر کو مد نظر رکھ کر فرق کیا جانا چاہیے کہ کون سے احکام سب کے لیے اور برابر قائم رہنے والے ہیں اور کون سے احکام ایک خاص طرز کی سوسائٹی، ایک مخصوص دور، اور ایک خاص علاقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں؟“ (ملاحظہ ہو ص ۱۹۵۶)۔

مطلب اس ارشاد گرامی کا یہ ہے کہ اسلام کے سارے ہی احکام نہ تو سب کے لیے ہیں اور نہ یہ ہر سوسائٹی، ہر دور اور ہر علاقہ کے لیے عام ہیں۔ اس کے بہت سے احکام عربوں کے لیے خاص ہیں، ان کو ساری دنیا پر لا دینا بالکل غلط ہے۔ بہت سے قوانین ایک خاص حرزی سوسائٹی کے لیے وضع ہوئے تھے، ان کو ہر طرح کی سوسائٹی کے سر منڈھ دینا حماقت ہے۔ بہت سے احکام ایک خاص دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو اس دور کے گزر جانے کے بعد بھی گھسٹتے چلے جانا محض وقیانوسیت اور جہالت ہے۔

اس زریں اصول اجتہاد کے لیے کسی قرآنی آیت یا کسی حدیث یا کسی ایسے ویسے امام و مجتہد کے قول کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے جس پر آپ کوئی حرف گیری کر سکیں بلکہ فقیہ اعظم طہنی سن (TENNYSON) صاحب کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا دین میں حجت قاطع ہونا ان لوگوں کی رائے میں گویا سب کے نزدیک مسلم ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ہر پرانا نظام نئے کے لیے جبکہ خالی کر کے تبدیل ہو جاتا ہے اور خدا اپنے آپ کو بے شمار شکلوں میں ظاہر کرتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ایک عمدہ نظام بھی دنیا کو تباہ کر کے رکھ دے۔

اول تو اس ذہنیت کو ملاحظہ فرمائیے کہ جن لوگوں کو پیغمبر کے ارشادات، صحابہ کے اقوال اور

آئمہ کے اجتہادات میں مجال کلام نظر آتی ہے وہ لوگ کس اطمینان سے ایک انگریز شاعر کے ایک قول کا ایک اصول اجتہاد کے ماخذ کی حیثیت سے حوالہ دیتے ہیں۔ واقعی انسان کی جب عقل ماری جاتی ہے تو عقل و گہر کو پھینکتا اور متنگنیوں سے دامن بھرتا ہے۔

اول تو میں ان حضرات سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر قرآن و حدیث کے احکام اور پیغمبر کے ارشادات ہر سوسائٹی، ہر دور اور ہر علاقہ کے لیے سند اور حجت نہیں ہیں تو ٹینیسی سن صاحب کی بکو اس پیر سوسائٹی، ہر قعہ اور ہر ملک و ملت کے لیے کس طرح حجت بن گئی ہے کہ آپ اس کو دلیل بنا کر مارے دین پر خط نسخ پھیر دینا چاہتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ ٹینیسی سن کا کہنا تو یہ ہے کہ ہر قدیم خواہ وہ کتنا ہی مقدس و محترم ہو اس دنیا کے لیے لعنت ہے اور ہر جدید خواہ وہ کتنی ہی بڑی لعنت ہے اس دنیا کے لیے نہ صرف رحمت اور برکت ہے بلکہ اسی کے ذریعہ سے اس دنیا میں فدا کی مرضی پوری ہوتی ہے، اگر اس کو اختیار نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عہد کے لیے خدا نے جس نظام کو اپنا دین قرار دیا ہے ہم اس سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اس بات کو اگر اور زیادہ واضح الفاظ میں کہا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانہ میں قرآن و اسلام کا نظام قائم ہوا تھا اس زمانہ میں خدا کی مرضیات کا مظہر اسلام رہا ہو تو رہا ہو لیکن اب اس عہد میں خدا کی مرضیات کا اگر مظہر ہے تو وہی نظام ہے جو اس وقت تہذیب مغربی کے نام سے موجود ہے۔ آج خدا اسی جیس میں جنم لے رہا ہے اور اگر اس کو اختیار نہ کیا جائے بلکہ اسلام کو اس کی جگہ لانے کی کوشش کی گئی تو یہ دنیا تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ تیسرے یہ کہ اگر آپ حضرات کا ایمان ٹینیسی سن پر ہے تو وہ تو قدیم میں سے کسی انتخاب کا مشورہ نہیں دیتا بلکہ پورے قدیم کو تیاگ دینے کا مشورہ دیتا ہے پھر آپ اسلام میں سے انتخاب کرنے کہاں چلے ہیں کہ اس کے جو احکام ہمہ گیر ہیں وہ تو سب سے جائیں اور جو وقت سوسائٹی اور خاص عرب کے ساتھ مخصوص تھے وہ چھوڑ دیئے جائیں۔ اگر آپ حضرات نے ٹینیسی سن کو سند بنا کر اس کے مشورہ کے بھی خلاف کیا تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس عرصہ آپ کو اسلام کی کوئی بات تحریر کے بغیر پسند نہیں آتی اسی طرح ٹینیسی سن پر بھی آپ حضرات کا ایمان اور ویاہن ہے۔ یکو ہو کر نہ آپ حضرات امت محمدیہ میں رہنا چاہتے ہیں اور نہ امت ٹینیسی سن میں۔

اچھا، اب اس بحث کو چھوڑیے کہ مینی سن کیا کہتا ہے۔ اب اس پر غور کیجیے کہ ارکان کمیشن جو کچھ فرماتے ہیں اس کی عملی شکل کیا ہوگی اور اگر ان کے تدبیر مشورہ پر عمل کیا جائے تو اس کے نتائج کس شکل میں ظاہر ہونگے؟ یہ حضرات اسلام کے ان احکام میں جو سب کے لیے ہیں اور ان احکام میں جو علاقائی اور وقتی ہیں امتیاز کر کے اول الذکر کو باقی رکھنے اور موخر الذکر کو منسوخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہم جی ٹی کے تھوڑی دیر کے لیے یہ مشورہ قبول کیسے لیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کر لیا کون؟ جہاں تک خدا اور رسول کا تعلق ہے انہوں نے تو عمومی احکام اور علاقائی اور وقتی احکام میں امتیاز کرنے کے لیے کوئی کسوٹی ہمیں دی نہیں ہے بلکہ سارے دین کو ایک ہی حیثیت میں دیا ہے اور سب کے لیے دیا ہے اور قیامت تک کے لیے دیا ہے۔ جو احکام وقتی تھے وہ اپنی مدت پوری کر چکے کے بعد منسوخ ہو گئے اور یہ کام خود اللہ اور رسول نے کر دیا۔ اب ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے کہ ہم شریعت کے احکام میں وقتی اور مستقل کی تفریق کریں اور کچھ کو باقی رکھیں اور کچھ کو منسوخ کر دیں۔ اگر خدا اور رسول کی بتائی ہوئی کسوٹی جس سے یہ کام انجام پاسکے، ارکان کمیشن کے علم میں ہے تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ اپنے اس مشورہ بلکہ اس جہاد کے ساتھ اس کو پیش کر دیتے تاکہ کام کرنے والوں کو آسانی ہوتی۔ لیکن اگر کسی وجہ سے وہ اس رپورٹ میں اس کو پیش نہیں کر سکے ہیں تو ہماری التجا ہے کہ وہ اب بھی اس کو پیش فرمادیں تاکہ یہ کار عظیم بسہولت اور بلا کسی نزاع و اختلاف کے انجام پاسکے۔ درنہ قدم قدم پر جھگڑا ہو گا۔ ایک شخص ایک حکم کو وقتی اور علاقائی قرار دے گا دوسرا اسی کو ابدی اور سب کے لیے عام بنائے گا اور اس طرح ایک ایک حکم پر علاقائی وغیر علاقائی کی جنگ برپا ہو جائے گی غرض کیجیے ایک شخص حج اور قربانی کے متعلق یہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے کہ یہ محض ایک علاقائی نوعیت کا حکم تھا، عربوں کو اپنے اب وجد کے طریق عبادت سے دلچسپی تھی اس وجہ سے اسلام نے اس کو اپنا لیا، ساری دنیا کے لیے اور وہ بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کے عام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے اس دعوے کا کیا جواب ہو گا؟ اسی طرح ایک دوسرا اٹھتا ہے وہ کہتا ہے کہ تحصیل زکوٰۃ کا طریقہ ایک خاص طرز کی سوسائٹی اور ایک مخصوص طرز کے معاشی اور تمدنی ماحول میں تو یہ نہ سکتا تھا لیکن اب جبکہ تشخیص و تحسین محاصل کے نہایت اعلیٰ طریقے جاری ہو چکے ہیں اسی فرسودہ طریقہ پر جمے رہنا بجلی کے قمتوں کے آگے مٹی کا دیا جلانے کے ہم معنی ہے۔ ایک

اور شخص کھڑا ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ اور نکاح و طلاق سے متعلق جو قوانین بنائے تھے وہ صرف ایک مخصوص طرز کی سوسائٹی ہی میں چل سکتے تھے اب تہذیب و تمدن کے اس دور میں انہی قوانین پر اصرار کرتے چلے جانا معاشرہ کو جامد بنا دینا ہے۔ کوئی صاحب اسی قسم کا سوال اسلام کے کاروباری احکام، یا نانا اور چوری کی تعزیرات یا اسلام کے اخلاقی احکام و آداب کے متعلق اٹھا دیتے ہیں کہ یہ ساری باتیں عرب کی غیر ترقی یافتہ سوسائٹی کے لیے خاص تھیں، یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہیں تو کوئی شخص ان کا کیا بگاڑ لے گا۔ اس طرح تو خدا کا سارا دین ہی ہوا ہو جائے گا، کچھ ایک خاص قسم کی سوسائٹی کے ساتھ مخصوص ہونے کے سبب سے منسوخ ہو جائے گا، کچھ وقتی قرار دے دیا جائے گا اور کچھ ملاقاتی۔

ارکان کمیشن نے اپنے اس اصول اجتہاد کی تائید میں مبنی سن کے مذکورہ بالا قول کے علاوہ غلامی سے متعلق اسلامی احکام کا خوالہ بھی دیا ہے کہ دیکھو ایک زمانہ میں یہ احکام کتنے محترم و مقدس تھے لیکن جب زمانہ کی ترقی سے سوسائٹی تبدیل ہو گئی تو یہ سارے احکام بے معنی ہو کر رہ گئے، اب نہ غلام ہیں نہ غلامی اور نہ غلامی سے متعلق اسلامی احکام۔ کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح سوسائٹی تبدیل ہو جانے کے بعد اب اگر شادی، بیاہ، طلاق و نکاح، حدود و تعزیرات اور سہ اور سود سے متعلق اسلام کے احکام بھی منسوخ ہو جائیں تو اس پر تعجب کیوں ہو؟

یہ مثال تو کمیشن نے دے دی لیکن اس کے ایک پہلو پر اس نے غور نہیں فرمایا کہ غلامی سے متعلق احکام جو بیکار ہوئے ہیں وہ تو اس وجہ سے ہوئے ہیں کہ غلام جن کے تحفظ کے لیے یہ قوانین ضروری تھے اب موجود نہیں رہے۔ اسی طرح اگر دنیا میں چوری باقی رہے تو اسلام کو اس بات پر ہرگز اصرار نہیں ہو گا کہ چوری کی سزا قطعید لازماً نافذ ہی کی جائے، یا زنا دنیا میں باقی نہ رہے تو بھی اس کی سزا کسی دُکسی پر ضرور نافذ کی جاتی رہے، یا تعدد ازواج کی کوئی شخصی، عائلی، قومی ضرورت نہ بھی باقی رہے تو بھی تعدد ازواج کی اجازت پر قانوناً عمل کرایا جائے۔ قوانین تو ضرورت کے لیے بنے ہیں۔ اگر ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو اس ضرورت کے لیے اسلام نے جو قانون بنایا ہے اس کے استعمال پر اسلام کو خواہ مخواہ اصرار کیوں ہو گا؟ لیکن اگر ایک ضرورت موجود ہے اور پہلے سے کہیں بڑھ چڑھ کر موجود ہے تو محض اس دلیل

پر کہ حالات تبدیل ہو چکے ہیں وہ قانون کیوں غیر ضروری ہو جائے گا جو اس ضرورت کے لیے اسلام نے بنایا ہے؟ غلامی اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہے تو یہ ایک مبارک بات ہوئی اور اب کسی کو بھی اصرار نہیں ہے کہ اس سے متعلق قوانین استعمال کرنے کے لیے ضرورت کچھ غلام مہتیا کیے جائیں۔ لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ چوری تو موجود ہے لیکن چوری کی اسلامی سزا پر آپ لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ زنا گلی گلی میں ہو رہا ہے لیکن زنا کی سزا کے تصور سے آپ حضرات کو وحشت ہو رہی ہے۔ سود کا کاروبار گونا گوں شکلوں میں ہو رہا ہے لیکن اس کے متعلق اسلام نے جو قانون بنایا ہے وہ منسوخ ہو جانا چاہیے۔ تعدد ازدواج کی ضرورت کا ہر پہلو موجود ہے، یہاں تک کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زنا کے دروازے چوڑے کھول دیئے گئے ہیں، مردوں اور عورتوں دونوں نے ذواتین و ذواتات کی ذیل حیثیت اختیار کر رکھی ہے، مغرب اور مغربیہ سوسائٹی میں داشتادوں کا ایک نظام قائم ہوتا چلا جا رہا ہے، لیکن تعدد ازدواج پر قدغن لگنی چاہیے کیونکہ زمانہ بدل چکا ہے۔ آخر زمانہ کس اعتبار سے بدل چکا ہے؟ کیا اس اعتبار سے کہ اسلام نے جن برائیوں کے سدباب کے لیے یہ قوانین بنائے تھے وہ برائیاں اب عرب جاہلیت کے مقابلے میں ہزار گنا بڑھ گئی ہیں یا اس اعتبار سے کہ اب وہ ناپید ہو چکی ہیں، یا اس اعتبار سے بدل گیا ہے کہ یہ ساری برائیاں اب تہذیب کے سانچے میں ڈھل چکی ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اسلام اس تہذیب کی خاطر اپنے قوانین منسوخ کرنے کے بجائے آپ کی اس تہذیب پر لعنت بھیجتا ہے اور اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تعاون کرنے کے بجائے اس کو جڑ پھڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنا پورا زور استعمال کریں۔

جو قطعی اور غیر مشروط طور پر ممنوع نہیں وہ جائز ہے | کمیشن نے اپنا ایک متفق علیہ اصول اختیار کیا ہے کہ جو چیز قطعی اور غیر مشروط طور پر ایک واضح حکم کے ذریعہ سے ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے اگر افراد یا قوم کی بہبود اس کا تقاضا کر رہی ہے۔ (ص ۱۲۰)

اس اصول کو اسلامی اصول فقہ کا ایک بنیادی اصول بتایا گیا ہے، حالانکہ اسلامی اصول سے اس کو کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے اصول فقہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ ”اشیا میں اصل شے اباحت ہے، حرمت ان پر شریعت کے حکم کے تحت وارد ہوتی ہے“ اب یہ وارد ہونا ایک واضح

حکم کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے، کسی نص کے اشارہ یا امتضا کے تحت بھی ہو سکتا ہے، اور امثال و نظائر پر قیاس کے واسطے سے بھی ہو سکتا ہے کسی چیز کی حرمت یا کراہت بیان کرنے کا طریق قرآن یا حدیث میں صرف یہی نہیں ہے کہ ہم نے فلاں چیز غیر مشروط و قطعی طور پر حرام کر دی، بلکہ اس کے بہت سے اسلوب ہیں کبھی ایک شے کا ثبوت پہلو بیان کر دیا جاتا ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آتی ہے کہ اس کا ضد اسلام میں حرام ہے کبھی ایک حکم خاص بیان ہوتا ہے اور سیاق کلام دلیل ہوتا ہے کہ اس طرح کی ساری چیزیں حرام ہیں۔ کبھی کسی چیز کی تحریم یا کراہت کے حکم ساتھ اس کی حرمت یا کراہت کی علت واضح کر دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن چیزوں کے اندر یہ علت پائی جائے گی وہ ساری چیزیں حرام یا مکروہ ہیں۔

ارکان کمیشن نے جو من گھڑت اصول اجتہاد اصول فقہ کی طرف منسوب کیا ہے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر تو اس اجتہاد کی بحث میں پڑنا لا حاصل ہی ہو گیا جس کی ضرورت ثابت کرنے پر ان حضرات نے اتنی قوت صرف فرمائی ہے۔ پھر تو ان چند چیزوں کے سوا جن کو قطعی اور غیر مشروط طور پر کسی واضح حکم کے ذریعہ سے "حرام ٹھہرا دیا گیا ہے" باقی ساری چیزیں جائز اور حلال و طیب ہو گئیں۔ اس کے بعد کسی اجتہاد و قیاس کی کلکھیر میں پڑنے کی ضرورت ہی کب باقی رہی۔ اور یہ غیر مشروط کی قید لگا دینے کے بعد تو اکثر پچھلی حرمتیں بھی ہوا ہو گئیں۔ کیونکہ بہت سی حرمتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ کوئی نہ کوئی شرط بھی لگی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں موجود زمانہ کے جتنے فتنے بھی ہیں انہوں نے ایک نیا سانچہ اختیار کر لیا ہے، آپ ان میں سے ہر چیز کی نسبت یہ فرما سکتے ہیں کہ وہ ان کی حرمت اسلام میں واضح اور غیر مشروط طور پر کہاں وارو ہے؟ بلکہ اس سے بڑھ کر اس اصول کے تحت آپ کے یہ سوال بھی معقول ہو جائیں گے کہ یہ کہاں واضح اور قطعی طور پر لکھا ہوا ہے کہ عورت توام نہیں ہو سکتی، یا عورت خود طلاق دینے کی مجاز نہیں ہے، یا عورت جہر ادا کرنے اور نفقہ دینے کی ذمہ داری قبول کئے ہو پر شوہرانہ اختیارات نہیں حاصل کر سکتی؟ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا حرام ہونا قطعی طور پر نہ قرآن یا حدیث میں کہیں بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں اگر اسلام میں ممنوع ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ اس نے جو اصول قائم کر دیئے ہیں یہ باتیں ان کے خلاف ہیں اس وجہ سے تو نہیں ہیں کہ قطعی اور غیر مشروط طور پر واضح الفاظ میں ان کی ممانعت وارو ہے۔ اپنے اس نادرا اصول کے بعد تو یہ حضرات

اگر کل کو یہ چیلنج کر دیں کہ قطعی اور غیر مشروط طور پر کہاں واضح الفاظ میں اس بات کی ممانعت وارد ہے کہ ایک عورت بیک وقت چار مردوں سے نکاح نہیں کر سکتی تو مجھے اندیشہ ہے کہ غریب مولوی ان لوگوں کو شاید ہی کوئی مسکت جواب دے سکیں۔

جدید اسوہ حسنہ کی پیروی کی دعوت | کمیشن کا چوتھا اصول اجتہاد یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے معاشرتی اور اقتصادی سانچے یکے کے مقابلے میں تبدیل ہو چکے ہیں اس وجہ سے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جس نقشے کو سامنے رکھ کر معاشرتی اور اقتصادی مسائل حل کیے گئے تھے وہ نقشہ اب کام نہیں دے سکتا۔ اب اس نئے نقشے کی پیروی کرنی چاہیے جو زمانہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :-

”موجودہ زمانہ کا معاشرتی اور اقتصادی نقشہ (PATTERN) اسلام کی ابتدائی صدیوں کے

مقابل میں قابلِ لحاظ حد تک تبدیل ہو چکا ہے“ (ص ۱۲۲۹)

اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ زمانہ کے اقتصادی اور معاشرتی سانچے اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مقابل میں تبدیل ہو چکے ہیں اور یہ تبدیلی ہم سے اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ ہمیں نئے پیدا شدہ مسائل کا اسلام کی روشنی میں حل ڈھونڈنا چاہیے۔ اگر اس تبدیلی کی خبر دینے سے کمیشن کا مقصد قوت کے اس مطالبہ کی طرف اشارہ کرنا ہے تو اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ ان تبدیلیوں میں سے ہر تبدیلی مستحسن ہے اور اس تبدیلی کے مطابق نہ صرف ہمیں بلکہ اسلام کو بھی تبدیل ہو جانا چاہیے تو کمیشن کچھ اس خیال کے ساتھ کوئی مقول آدمی اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ان میں سے بہت سی تبدیلیاں ایسی ہیں جو زمانہ جاہلیت کی طرف رجعت کے حکم میں داخل ہیں اور ان کو نہ صرف یہ کہ ہمیں قبول نہیں کرنا ہے بلکہ اگر ہم اسلام کو جاہلیت پر غالب دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں ان کی اصلاح کرنی ہے۔ کمیشن اگر زمانہ کی ہر تبدیلی کو مبارک سمجھتا ہے اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنا سب کچھ بدل لینے کا مشورہ دیتا ہے تو ہمارے نزدیک یہ مشورہ نہایت غلط ہے۔

اس اصول اجتہاد کے قائم کر لینے کے بعد سجدہ میں نہیں آنا کہ پھر بار بار کمیشن نے یہ دعویٰ کرنے کی غلطی کیوں

کی ہے کہ ہم جو کچھ فرما رہے ہیں وہ عین کتاب و سنت کی روشنی میں فرما رہے ہیں۔ پھر تو نہ اسلام ایک نبی کامل رہا اور نہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ دائمی رہا۔ اگر یہ کہا گیا تھا کہ اَلْيَوْمَ اكُنْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ اب میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، یا یہ فرمایا گیا تھا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لیے رسول کے طریقہ کے اندر نمونہ ہے) تو یہ ساری باتیں وقتی اور زمانی ہوں۔ پیڑی کے لیے اصلی اسوہ تو زمانہ کا اسوہ ہوا۔ پھر کتاب و سنت کا حوالہ دینے کا تکلف کیوں کیا گیا۔ پھر تو یہی ایک فیصلہ کن بات کہنے کی تھی کہ موجودہ زمانہ کے معاشرتی اور اقتصادی سانچے اہم ہیں اس لیے قرآن و سنت کو اب بالائے طاق رکھو، یہ دقیانوسی چیزیں اب چھیننے والی نہیں ہیں۔

ارکان کمیشن نے اس اصول کے بیان کرنے میں غایت اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ واضح نہیں فرمایا کہ موجودہ زمانہ کی وہ کیا اقتصادی و معاشرتی برکتیں اور محنتیں ہیں جن کے ظہور میں آجانے کے بعد اب اسلام کی بساط لپیٹ دینی چاہیے؛ اس وقت کے سماجی و اقتصادی نظام کی بہترین نمائندگی تو انگریز ادا مرکین یہ دسی کر رہے ہیں۔ آخر ان کی وہ کون سی چیز ہے جس کے اتباع اور جس کے لیے اسلام کو چھوڑنے کی ارکان کمیشن دعوت دے رہے ہیں۔ ہم تو ان دونوں ہی کے معاشرتی اور اقتصادی نظام پر یکساں لعنت بھیجتے ہیں اور ان کو دنیا کے لیے عذاب سمجھتے ہیں۔ اگر ارکان کمیشن ان کے ماسوا کوئی اور معاشرتی اور اقتصادی نظام اپنے ذہن میں رکھتے ہیں تو براہ کرم ارشاد ہو کہ وہ کیا ہے۔ کیونکہ اس رپورٹ کے اندر تو غریب کی اندھ اور امتناع تقلید کے سوا ہمیں کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔

نئی سنت اور نئی ذمہ داری کی ضرورت | کمیشن کا پانچواں اصول اجتہاد یہ ہے کہ:

”انسانی روابط کے بنیادی اصول جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ تو ہمیشہ قائم رہیں گے۔ کمیشن

ان کے نفاذ اور تطبیق کا طریق حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہیے“ (ص ۱۲۲۹)

اول تو یہ کمیشن کو یہ متعین فرما دینا چاہیے کہ انسانی روابط کے بنیادی اصول ”جس لیے اس رپورٹ سے تو جو کچھ واضح ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی بنیادی نہیں ہے جو ان حضرات کے نزدیک تبدیل نہ ہو سکتی ہو۔“ اگر کوئی چیز ایسی ہے تو اس کو واضح اور متعین ہو جانا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اگر کسی اصول

کو خود قرآن نے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ کے متفقہ عمل نے زندگی کے حالات پر تطبیق دے کر دکھا دیا ہو تو اس کی بابت کیا ارشاد ہے؟ اس کو باقی رہنا چاہیے یا نہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن کریم صرف چند اصولوں ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس نے اصولوں کو زندگی پر تطبیق بھی کیا ہے۔ اور سنت تو نام ہی ہے زندگی کے معاملات پر قرآنی اصولوں کی تطبیق کا۔ یہی خدمت اپنے اپنے دور میں ائمہ اسلام نے انجام دی ہے۔ کیا ان سب کے بارے میں ارکانِ کمیشن کا مشورہ یہ ہے کہ ان کو یکسر نظر انداز کر کے قرآن کے اصولوں کو از سر نو زندگی کے حالات پر تطبیق دی جائے اور نئی سنت اور نئی فقہ مرتب کی جائے؟

اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت | ان کا چھٹا اصول اجتہاد یہ ہے کہ:

”شادی، طلاق، ولایت، تولیت اور وراثت سے متعلق قوانین و ضوابط، خاندانی تعلقات میں

تحفظ و استحکام اور کمزوروں کی مدد کے نقطہ نظر سے از سر نو ترتیب ماصلاح (COVER HAULLING)

کے محتاج ہیں۔“ (ص ۱۲۲۹)

یہ احکام و قوانین ظاہر ہے کہ صرف ائمہ اور فقہاء کے اجتہادات ہی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کا بہت سا حصہ خود قرآن میں بیان ہوا ہے، پھر ان کی تفصیلات احادیث میں مذکور ہوئی ہیں، اس کے ایک حصہ پر خلفائے راشدین کا اجماع ہے اور کچھ حصہ ہے جو فقہاء کے اجتہادات سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر یہ سب نظر ثانی اور جانچ پڑتال کے محتاج ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان میں سے جو بدے ہوئے حالات کے اندر اختیار کیے جانے کے لائق ہیں وہ تو رکھ لیجے جائیں اور حمان حضرات کے خیال میں فرسودہ اور کہنہ ہو چکے ہیں وہ ترک کر کے ان کی جگہ پر نئے قوانین وضع کر لیجے جائیں۔

خاندان کے استحکام و تحفظ اور کمزوروں کی سہمدی کا جو درد ان حضرات کے اندر اٹھا ہے اس کی حقیقت آگے چل کر واضح ہوگی جب آپ کے سامنے وہ تجاویز اور سفارشات آئیں گی جو ان حضرات نے مذکورہ بالا مقصد سامنے رکھ کر مرتب کی ہیں، ان کے ان پر تبصرہ کر کے دکھاؤں گا کہ اگر یہ سفارشات اور تجویزیں منظور ہو جائیں تو صبح و شام میں ہمارے معاشرہ کے ایک ایک خاندان کی اینٹ سے اینٹ بچ جائے گی اور ہمارے اندر بھی میاں کا بیوی کے ساتھ اور بچوں کا والدین کے ساتھ وہی رسمی اور بے وضع

تعلق رہ جائے گا جو آج انگلستان اور امریکہ کے اکثر گھروں میں نظر آتا ہے اور جس پر دہاں کے سنجیدہ لوگ ماتم کہہ رہے ہیں۔ نیز کمزوروں کی جس سہمدی کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی حقیقت بھی واضح کروں گا کہ ان کی تجویز کردہ اصلاحات سے، اگر وہ عمل میں آجائیں، طبقہ نسواں کی کیا گت بنے گی؟

عہدِ طفولیت کے احکام کی ترمیم و اصلاح | ہمارے ان نئے آئمہ کا سافاں اصول اجتہاد یہ ہے کہ اسلام نے بعض چیزوں کی اجازت شروع شروع میں اس لیے دی تھی کہ اس وقت انسانی سائنس اپنے دورِ طفولیت میں تھی اس لیے اس دورِ کمال و ترقی میں اگر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ لوگ ان اجازتوں سے غلط نمائندہ اٹھا رہے ہیں تو غرضی ہے کہ ان پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن سے اس سوء استعمال کے نقصانات کو زیادہ سے زیادہ ختم کر کے کم کیا جاسکے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”خاص قسم کی معاشرتی بیماریاں خاص قسم کے علاج کی محتاج ہوتی ہیں۔ اگر اسلام نے ایک چیز کا حکم نہیں بلکہ صرف اس کی اجازت اس لیے دی تھی کہ انسانی سوسائٹی ہنوز اپنے دورِ طفولیت میں تھی اور یہ اجازت غلط طور پر استعمال ہو رہی ہے تو اس اجازت پر مزید پابندیاں اور شرطیں عائد کی جاسکتی ہیں تاکہ موجودہ خواہیوں کو ممکن حد تک کم کیا جاسکے۔“ (ص ۱۲۲۹)

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ اسلام کی اجازتیں ہوں یا احکام یہ سب فطرت پر مبنی ہیں، فطرۃ اللہ التي فطر الناس علیہا۔ اور انسان کی فطرت ہر دور، ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایک ہی رہنی چاہیے۔ اس وجہ سے اسلام کے احکام ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے یکساں طور پر انسان کی فطرت کے مطابق ہیں۔ جو چیزیں زمانہ اور آب و ہوا سے متاثر ہوا کرتی ہیں ان کے بارے میں اسلام نے کوئی حکم ہی نہیں دیا ہے تاکہ لوگ اپنے اپنے حالات کے تحت ان میں جو رویہ پسند کریں اختیار کر سکیں۔ لیکن ہمارے یہ نئے آئمہ ہیں یہ خبر دیتے ہیں کہ اسلام کے احکام میں ایسے احکام بھی ہیں جو محض انسانی سوسائٹی کے دورِ طفولیت کے تقاضوں کے تحت دیئے گئے تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور ان حضرات کا یہ فرمانا بھی صحیح ہے کہ اس طرح کے احکام یا اجازتوں میں اس دورِ ترقی و کمال میں ترمیم و اصلاح ہو جانی چاہیے تو گزارش یہ ہے کہ صرف ترمیم و اصلاح یا مزید پابندیوں کے اضافہ ہی پر کیوں

اکتفا کیجیے، اس طرح کے احکام اور اجازتوں کو سرے سے ختم ہی کیوں نہ کر دیجیے؛ آخر بچپن کے اس جگہ کو اس شباب کے زمانہ میں پہنچنے کا کیا کہاں کی دانائی ہے؛ اس میں پیوند لگا لگا کر اور کھینچ تان کر کہاں تک اس لنگوٹی کو اپنے جسم پر راست لانے کی کوشش کریں گے؛ غرض کیجیے کچھ دنوں تک آپ اس سے اپنی ستر ڈھانکنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس سے کیا بنتا ہے، آخر ایک نہ ایک دن تو یہ آپ کو اتار کر نیا جگہ زیب تن کرنا ہی پڑے گا؛ پھر جو کام بہت سی ذلتوں اور رسوائیوں کے بعد کل آپ کو کرنا ہی ہے تو آج ہی اس سے کیوں نہ فارغ ہو جائے؛

پھر اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر اسلام کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا جبکہ انسانی سوسائٹی اپنے دورِ طفولیت میں تھی اور اس سبب سے اس نے بعض ”طفلاء“ احکام دے دیئے تو آخر بعض ہی احکام کیوں طفلاء نہ دیئے؛ عقل و حکمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ سارے ہی احکام سوسائٹی کے سن و سال اور اس کے عقلی معیار کے مطابق دیئے گئے ہوں۔ بچوں کو تو کوئی سبق بھی ایسا نہیں پڑھایا جاتا جو بڑھوں کے لیے موزوں ہو۔ ان کو تو سارے ہی سبق وہی پڑھانے جاتے ہیں جو ان کے ذہن و امدان کی استعداد کے مطابق ہوں۔ اس دلیل کو مبادیہ بنا کر اگر ایک شخص یہ کہے کہ پورا اسلام انسانی سوسائٹی کے عہدِ طفولیت کا دین ہے اور اس تہذیب و ترقی کے زمانہ میں اس کی کوئی چیز بھی اختیار کیے جانے کے لائق نہیں ہے تو اب، انہی قیود پر مبنی کر لینے کے بعد اس کا کیا جواب دیا جاسکتا ہے؛ پھر تو روزہ اور نماز سے لے کر حدود و تعزیرات اور بیوع و معاملات تک سب اس کی زد میں آجائیں گے اور ایک ایک چیز کے متعلق بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جاسکے گا کہ اسلام نے سوسائٹی کے ابتدائی اسٹیج میں یہ حکم دے دیا تھا اب اس میں قیود و اصلاح ضروری ہے۔ کیا ان کا ان کمیشن اپنے اس اصول اجتہاد سے اسی فتنہ کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں؛

اس اصول کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ العباد باللہ خدا نے اپنے آخری نبی کو بالکل قبل از وقت بھیج دیا جب کہ وہ اس دنیا کو کسی ایسے دین کی تعلیم نہیں دے سکتے تھے جو رہتی دنیا تک قائم رہ سکے اس لیے یا تو ایک خاتم الانبیاء اب اس دورِ کمال و ترقی میں آئے یا کم از کم نبوت کا سلسلہ (خواہ وہ ظلی ہو یا بروفی) قائم و دائم رہے۔ کیا ان کا ان کمیشن اپنے قیستی اجتہاد کے اس قیستی نتیجہ کو تسلیم کرتے ہیں؛

یہ فقہت بھی قابلِ داد ہے کہ اگر لوگ کسی حکم یا کسی اجازت کی شرطیں پوری نہیں کر رہے ہیں تو ان پر مزید شرطیں عائد کر دی جائیں۔ ایک طرف تو یہ حضرات پرانے فقہاء پر یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ انہوں نے دین کو احصاء و اغلال کا ایک مجموعہ بنا دیا ہے۔ دوسری طرف خود اپنا رویہ یہ ہے کہ لوگ چونکہ چار شرطیں پوری نہیں کر رہے تھے اس وجہ سے انہوں نے چار کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ اگر ان مزید چار کے اضافے کے بعد بھی وہی الجھن باقی رہے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا مزید شرطوں کا اضافہ ہو گا یا سرے سے اجازت ہی منسوخ کر دی جائے گی؟ آخر ان دانشوروں نے اس پہلو پر کبھی کیوں نہیں غور فرمایا کہ جب انسانی سوسائٹی اپنے ”دورِ طفولیت“ میں تھی تو اسلامی حکومت نے کس طرح لوگوں سے یہ شرطیں پوری کرائیں؟ کیا زمانہ کی ترقی اور اس کے کمال کی یہی دلیل ہے کہ عہدِ طفولیت کی حکومت تو لوگوں کو آزادی دے کر بھی حدود کی پابند رکھ سکتی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ان حدود سے آگے پیچھے ہو سکے لیکن دورِ کمال میں جب تک انسان کے جورِ جور کو باز نہ لیا جائے اس وقت تک اس سے دو بیویوں کے درمیان عدل بھی نہیں کرایا جاسکتا؟ اگر اس دورِ کمال کی یہی برکتیں ہیں تو خدا ان لوگوں کی عقلوں پر رحم فرمائے جو اسلام کے عہدِ اول کی سوسائٹی کو ”عہدِ طفولیت“ کی سوسائٹی کہتے ہیں اور اپنی سوسائٹی کو ”دورِ شباب“ کی سوسائٹی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو اس شباب سے وہ بچپن ہی اچھا ہے جب انسان میں اتنا ہوش گوش تھا کہ آزاد رہ کر بھی وہ حدود کی پابندی کرتا تھا۔ ہم انسانیت کے گلِ سرسبد انہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جنہوں نے انسان کی اتنی اعلیٰ تربیت کا انتظام کیا کہ ان حضرات کو جو پیدا ہوئے ہیں عہدِ کمال و ترقی میں لیکن سریتیں وہ کرتے ہیں جن پینچوں کو بھی شرم آئے۔

استحسان | آٹھواں اصول اجتہاد جس پر ان حضرات نے اعتماد فرمایا ہے وہ استحسان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ استحسان کے اصول کو فقہائے حنفیہ مانتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو ان حضرات نے اس کا سمجھا ہے۔ یہ حضرات تو اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کے مفاد کو سامنے رکھ کر جو جی میں آئے قانون بنا ڈالے جائیں۔ یہ استحسان ہو گا اور یہی فقہائے حنفیہ کے نزدیک ایک نہایت معتبر اصول اجتہاد ہے جس سے ماضی میں بے شمار قانونی مشکلیں حل کی گئی ہیں۔ لیکن میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ استحسان کے متعلق یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جس دائرہ میں کتاب و سنت

یا اجماع کی کوئی رہنمائی موجود ہے وہاں اس کا کوئی کام نہیں ہے، وہاں جو کچھ کتاب و سنت یا اجماع سے ثابت ہے وہی اصل ہے۔ اگر حنفیہ اس اصول کو کوئی اہمیت دیتے ہیں تو اس دائرہ میں دیتے ہیں جس دائرہ میں سادہ مدار بحث قیاس یا عرف و مصلحت پر ہے۔ اس دائرہ میں بعض مرتبہ ایک خاص صورت حل یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک بات قیاس کی رو سے تو قوی معلوم ہوتی ہے لیکن مصلحت اور ضرورت کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں حنفیہ کا ایک گروہ اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ قیاس کو چھوڑ کر مصلحت کو اختیار کر لیا جائے اور اس کو وہ امتحان کہتے ہیں۔

امام شافعی اس امتحان کے بڑے مخالف ہیں۔ وہ اس کو ایک مستقل تشریع قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا حق اللہ اور رسول کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر امتحان کا یہ مفہوم سمجھا جائے کہ محض مصلحت اور مفاد کو سامنے رکھ کر جس کے جو جی میں آئے قانون بنا ڈالے، جیسا کہ ارکان کمیشن کہتے ہیں، یا ایک صحیح قیاس پر بھی محض مفاد کو ترجیح دے دی جائے تو یہ ایک مستقل تشریع ہوئی جس کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں مصلحت یا ضرورت کا ایک خاص دائرہ ہے جس میں اسلام نے سرے سے دخل ہی نہیں دیا ہے۔ اس دائرہ میں مصلحت اور ضرورت ہی ہمارے رہنا ہیں اس وجہ سے اس میں ہم انفرادی یا اجتماعی طور پر مصالح اور حالات کی رعایت کے ساتھ جو کچھ کریں گے اگر وہ دین اور اخلاق کے کسی اصول کے منافی نہیں ہے تو وہی حق ہے اور اسی میں خدا کی رضا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حنفیہ اسی دائرہ میں امتحان کے قائل ہیں اور اسی کو مالکیہ مصالح و مسائل سے تعبیر کرتے ہیں۔

کمیشن کی سفارشات

کمیشن کی سفارشات جن عقائد و نظریات اور اجتہاد کے جن اصولوں پر مبنی ہیں، پچھلی دو فصلوں میں ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں۔ اب میں اصل سفارشات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ سفارشات پر تبصرہ کرنے میں عموماً دو باتیں میں پیش نظر رکھوں گا۔ ایک یہ کہ کمیشن نے ہر سفارش کی تائید میں جو دلائل دیئے ہیں ان پر تنقید کر کے ان کی حقیقت واضح کر دینا کہ یہ کچھ وزن رکھتے ہیں یا نہیں؟

دوسری یہ کہ ہمارے معاشرہ کو عموماً اور طبقہ نسواں کو خصوصاً ان سفارشات سے جو نقصانات پہنچیں گے ان کو ماضی کر دینا تاکہ جو حضرات اس رپورٹ کو آسانی برکت سمجھ رہے ہیں اور جو بیگمات اس کو جلدی سے جلدی قانون کی شکل دے دینے کے لیے مطالبہ کر رہی ہیں وہ اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کریں۔

نکاح کی رجسٹری کمیشن نے سفارشات کی ہے کہ از روئے قانون ہر نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دے دی جائے۔ رجسٹری کا طریقہ کمیشن نے اپنے نزدیک آسان سمجھ کر یہ تجویز کیا ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک معیاری نکاح نامہ مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔ یہ نکاح نامہ ہر ٹاک خانہ سے معمولی قیمت راکھ آئے پر مل سکے۔ یہ سہ ورتی ہو۔ نکاح کے وقت نکاح خواں اور گواہوں کی موجودگی میں اس کی خانہ پری کر کے اس کی ایک کاپی دو ملکا کے حوالہ کر دی جائے، دوسری کاپی دو ملہن یا اس کے ولی کو دے دی جائے اور تیسری کاپی نکاح خواں جو ابی رجسٹری کے ذریعہ سے حلقہ کے تحصیلدار کے پاس بھیج دے تحصیلدار کے پاس ایک مخصوص رجسٹر ہو گا جس میں ان تمام نکاح ناموں کی نقلیں محفوظ رہیں گی۔ نکاح نامہ کی ایک نقل تحصیلدار کو بھیجنا نکاح خواں کا کام ہو گا۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کو پانچ سو روپے جرمانہ تک کی مراد دی جاسکے گی۔

کمیشن نے نکاح کی رجسٹری لازمی کرنے کے حق میں جو دلیلیں دی ہیں اب ان کا جائزہ لیجیے۔

پہلی دلیل — جو ایک شرعی دلیل کی حیثیت سے لائی گئی ہے۔ یہ ہے کہ قرآن مجید میں مالی بین میں کے مسئلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ **اِذَا تَدَايَيْتُمْ بَيْنَ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاَلْتُمُوهُ رَاٰرْتُمْ لَوْنِي مَالِي مِّنْ دِيْنٍ لِّكَ** مدت معینہ تک کے لیے کرو تو اس کو لکھ دیا کرو۔ کمیشن نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب مالی بین دین کے معاملہ میں تحریر کا حکم دیا گیا ہے تو نکاح کا معاملہ تو مالی بین دین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے؛ نیز اس میں دین ہر کی شمولیت بھی ہے جس کے بعد تو اس کے ایک واقعی مالی معاملہ ہونے میں بھی کوئی شک نہیں وہ جاتا پھر اس میں تحریر کیوں نہ ضروری قرار دے دی جائے؟

اگر یہ کمیشن کے اس استدلال پر یہ سوال پہلی نظر ہی میں سامنے آجاتا ہے کہ جب مالی بین دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے تحریر کا حکم دیا ہے تو کمیشن کے بقول جو معاملہ اس سے زیادہ اہمیت رکھنے والا ہے آخر

اس میں بھی خود اللہ تعالیٰ ہی نے تحریر کا حکم کیوں نہ دے دیا؟ کیا کمیشن کی رائے میں اللہ میاں سے یہ چوک ہو گئی؟ لیکن میں اس سوال کو نہیں چھیڑنا چاہتا۔ اگر کمیشن کا استدلال اس آیت سے صرف اس حد تک ہوتا کہ مالی لین دین کی طرح نکاح سے متعلق ضروری کارروائیوں کا بھی مفید تحریر میں آجانا ایک مستحسن فعل ہے، تو خواہ یہ استدلال صحیح ہوتا یا غلط، مجھے تحریر کو مستحسن مان لینے میں تامل نہ ہوتا۔ لیکن وہ اس آیت پر بنا رکھتے ہوئے نکاح کی رجسٹری کو لازم قرار دیتا ہے، رجسٹری نہ کرنے کو جرم مستند منراٹھہرا تہا ہے، اور اس کا منشا یہ بھی ہے کہ جن نکاح کی رجسٹری نہ ہو اس کے وقوع کی دوسری شہادتیں موجود ہونے کے باوجود عدالتیں اس کو جائز تسلیم نہ کریں۔ حالانکہ اس آیت میں خود مالی لین دین کے لیے بھی جس سے یہ براہ راست متعلق ہے، تحریر کو لازم نہیں کیا گیا ہے نہ عدم تحریر کو مستند منراٹھہرا تہا کیا گیا ہے، اور نہ ہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ جس فرض کی لکھا پڑھی نہ ہو وہ سرے سے قرض تسلیم ہی نہ کیا جائے گا۔ آیت کا اصل حکم تو زیادہ سے زیادہ بس اسی حد تک جانا ہے کہ مالی معاملات کا تحریر میں آجانا اچھا ہے تاکہ شہادت قائم ہونے میں آسانی ہو اور شک کی گنجائش نہ رہے۔ اس پر قیاس کر کے کمیشن بس اتنی ہی سفارش نکاح کے معاملہ میں بھی کر سکتا تھا، اور اگر وہ ایسا کرتا تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، بلکہ میں خود اس کو مختلف پہلوؤں سے مفید چیز سمجھتا ہوں۔ اعتراض اگر ہے تو نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دینے پر ہے۔ اس چیز کا ثبوت مذکورہ بالا آیت سے یہاں نہیں ہوتا کیونکہ مذکورہ آیت میں جس تحریر کا حکم ہے وہ خود ہی لازمی نہیں ہے تو اس پر قیاس کر کے آپتے جو حکم نکالا ہے وہ کیسے لازمی ہو جائے گا؟

”دین مہر“ کے لفظ سے جو نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ نکتہ بھی محض ایک نکتہ بار دہ ہے۔ مہر کے لیے ”دین مہر“ کی اصطلاح تو ہماری امداد آپ کی ہے، قرآن یا حدیث میں تو یہ اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوئی ہے۔ ان میں یا تو مہر کا لفظ استعمال ہوا ہے یا اسی کے ہم معنی کوئی اور لفظ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو قرآن یا حدیث میں مہر کے متعلق دین ہونے کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ میں تو مہر کے متعلق عام قاعدہ یہ تھا کہ جو مہر معین ہوتا تھا وہ عموماً نکاح کے وقت ہی یا اس کے معا بعد ادا کر دیا جاتا تھا۔ اگر اس طریقہ کو آج رواج دیا جائے تو اس سے ہزاروں بکھڑوں سے چھٹی مل سکتی ہے لیکن ہماری